رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ

کا

آخری مشورہ

جس کو مولانا نے یکم جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو قلمبند کرایا۔ دوسری جنوری کو تصحیح کے بعد اس میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ تیسری جنوری کو مولانا بیہوش ہوگئے اور آخرکار ۴ جنوری کو ۹½ بجے صبح کے ہائڈ پارک ہوٹل لندن میں اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ فرما گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یعنی

رئیس الاحرار کا وہ آخری خط جو انہوں نے وزیر اعظم انگلستان کی خدمت میں بغرض اشاعت روانہ کیا، تاکہ وہ گول میز کانفرنس کے تمام نمایندوں کے پاس پہنچ سکے۔

معہ دیباچہ از

مولٰنا شوکت علی صاحب

جمعیتہ مرکزیہ خلافت ہند نے بمبئی سے شائع کیا

جیّد برقی پریس دہلی میں چھپا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ میرا بھائی اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر نڈر اور ان تھک کوششوں کیساتھ ہمیشہ کام کرتا اور لڑتا رہا آخر میں اُسکی بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کرلی تھی۔ صحت جسمانی بد سے بدتر ہوچکی تھی اور اُسکے تمام دوست و اطبا، اسکو متنبہ کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان کو ایسی حالت میں نہ چھوڑے جبکہ اسکی جان خطرہ میں ہو مگر اُسنے کسی کی نہ سُنی اور انگلستان کو روانہ ہوگیا تاکہ وہ اس گول میز کانفرنس کی کارروائی میں شریک ہو جو ہندوستان وانگلستان اور اُسکے ملحقین کے درمیان ایک صحیح اور باعزت سمجھوتہ کے لیئے منعقد کیگئی تھی محمد علی نے اپنے دوستوں اور طبی مشیر کاروں کی تنبیہ کا صرف یہ جواب دیا کہ ایک سپاہی کا فرض ہے کہ جب اسکا مذہب و ملک خطرہ میں ہو تو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے فرض منصبی کو پورا کرے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اسکے چند ساتھی اس سے برگشتہ ہوگئے ہوں اور ان کا ایک اہم گروہ اسکے مشورے سے انکار کردے اور اس لائحہ عمل کو قبول نہ کرے جسکو تمام مختلف الآراء مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت نے بالاتفاق منظور کرلیا ہو۔ محمد علی نے کہا کہ میں اپنی ساری زندگی کام کے لیئے زندہ رہا اور اسوقت اپنے آرام و صحت کی خاطر کام سے منہ موڑ لینا ایسا فعل مجرمانہ ہوگا جو صرف نامردوں اور بزدلوں کے لیئے موزوں ہے۔

وائسرائے ہند لارڈ اروِن کے خلوص اور نیک نیتی پر اسکا یقین تھا اسلئے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستانی شہزادگان - لبرل جماعت اچھوت جماعت - اور مسلم پبلک کی کثیر جماعت کے مطالبات کی تائید میں اپنی آواز بلند کرے - برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی لوگوں کی طرف سے اتحاد عمل کی اسکو کچھ زیادہ امید نہ تھی پھر بھی اسنے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب آخری مرتبہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو برطانیہ کے سامنے پرزور الفاظ میں صفائی کیساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ وہ ہمارے ہندوستان جنت نشان کی تبدیل شدہ حالت کا صحیح طور سے اندازہ کرلیں اسکے بعد بھی اگر وہ اپنی پرانی غلط پالیسی پر حامل رہیں اور ہندوستانیوں کیساتھ بے اعتمادی کا برتاؤ کرتے رہیں تو اُن کو اختیار ہے بدقسمتی سے انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کی قیادت میں پرانے رفقاء کار کی تنبیہوں اور مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے تحریک سول نافرمانی پورے زور شور کے ساتھ جاری کردی جو حکومت برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی اور جس نے اپنے اُن ہم وطنوں کو بھی محفوظ نہ چھوڑا جو اس سے اختلاف رائے رکھتے تھے - محمد علی بہادر تھا اور اُسکو اپنے یقین کامل پر پورا بھروسا تھا صداقت وحق گوئی کی راہ سے کوئی زبردست سے زبردست طاقت اسکا منہ نہیں موڑسکتی تھی ذاتی خطرات کی وہ ذرہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا اور اسنے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ صلح وآشتی کے حصول میں اپنی جان تک کی پرواہ نہ کریگا اخبارات کا ایک فرقہ اور رجعتی پروپیگنڈا کرنیوالوں کا ایک گروہ محمد علی پر لعن طعن کرنے مین برابر مشغول رہا اس مسلسل مخالفت نے محمد علی کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا - خدا کے فضل وکرم سے مسلم جماعت اسکے ساتھ تھی اور وہ باوجود اپنے بہت سے کمزور اور نرم دل ساتھیوں کی معیت کے بہادری کیساتھ تن تنہا لڑتا رہا اور اپنی پالیسی کی جرات - خوش مزاجی اور عقلمندی کیساتھ حمایت وتائید کرتا رہا - کام کی سختی نے اُسکو ہلکان کردیا اور اُس نے خوشی

خوشی آخری وقت تک لڑتے ہوئے اپنی جان عزیز قربان کر دی۔ میرے خیال میں وہ اپنی موت سے ایسا کام کر گیا ہے جو اگر آج وہ زندہ ہوتا اور پر مغز لیکچر و خطبات دیتا ہوتا یا اخبارات میں بہترین مضامین لکھتا ہوتا تو تب بھی نہ کر سکتا۔

تمام حضرات سے میری درخواست ہے کہ وہ ان پیش کردہ چند صفحات کو جسمیں محمد علی نے اپنے دلی مقاصد کا اظہار کیا ہے۔ صفائی قلب احتیاط اور توجہ کے ساتھ پڑہیں محمد علی اپنے خدا کو منہ دکھانے جا رہا تھا اور اسکی جیسی طبیعت والا آدمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا۔ محمد علی بڑا زبردست انشا پرداز تھا اور اسکا طرز تحریر پر مغز و پر مذاق ہونے کیساتھ ساتھ ہمیشہ نہایت زور دار اور دلچسپ بھی ہوتا تھا۔ مگر ان پیش کردہ صفحات میں بہت سے دوست محسوس کرینگے کہ اُسکا طرز تحریر غیر معمولی طریقہ سے سادہ اور دلسوز ہے اور تمام لوگوں کو موجودہ صورت حال کی سنجیدگی کو اچھی طرح محسوس کرنے کیلئے آخری مرتبہ متنبہ کر رہا ہے۔ برطانیہ اور برطانوی لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی ہندوستان کے ۳۵ کروڑ نفوس کی آئندہ بہتری و خوشحالی موجودہ صورت حال کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے پر موقوف ہے۔

محمد علی نے مخلوط انتخاب کی موافقت کی تھی اور ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کی اکثریت کو مشترکہ انتخاب کے جو ان کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا ترک کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ اسوقت بدقسمتی سے مہاسبھائی ہندوؤں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ کچھ اسکے نام نہاد قوم پرست رفقائے کار کی طرف سے بھی غیض و غضب اور غیر رواداری کا اظہار کیا گیا۔ مگر محمد علی نے اسکی پرواہ نہ کی۔ اس نے اچھی طرح مسلمانوں کی اکثریت سے مشترکہ انتخاب کے مطالبہ کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا مسلم جماعت ہندوؤں کی جو ہندوستان میں ۷۵ فیصدی ہیں ایمانداری راست بازی اور انصاف پسندی پر اعتماد نہیں کر سکی۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی جماعت کے متعلق یہ شبہہ ہوا کہ وہ فیاض طبیعت نہیں ہے کیونکہ خود اپنے لاکھوں ہم مذہبوں کے ساتھ وہ جماعت ایسا برتاؤ کر رہی تھی اور انکو ایسے حقوق کے دینے سے بھی انکار کو ہی

تھی جو کتوں، گھوڑوں، بکریوں اور بھینسوں جیسے ایک حیوانوں کو دئے جاتے ہیں۔ ان حیوانوں میں گائے کو شامل کرنا تو محض بے کار ہے کیونکہ وہ تو مقدس سمجھی جاتی ہے اور سب لوگ، اسکی پوجا کرتے ہیں۔

محمد علی یہ چاہتا تھا کہ وہ تعصب سے بھری فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاتمہ کر دے اسلیئے اسنے صورت حالات کی مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے مشروط مخلوط انتخاب کی ایک ایسی صورت پیش کی جو ہر ہندو اور مسلمان کو مجبور کریگی کہ وہ اپنے انتخاب کیلئے دونوں مذاہب کے پیروؤں کے پاس جائے اور اسطرح پر آپس کی اخوت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ایسے آدمی کو منتخب ہونے دے جو کٹر متعصب اور فرقہ پرست ہو۔ اس طرح پر ایسے لوگ منتخب ہو سکیں گے جو ہندو اور مسلمان دونوں کے پسندیدہ ہوں گے۔ اس طریقہ سے اکثریت اور اقلیت دونوں مطمئن ہو سکینگی اور تنگ دلی و فرقہ وارانہ تعصب کا جو آجکل اکثر قوم پرستی اور حب وطن کے جامہ میں نظر آتا ہے سد باب ہو جائے گا۔

میں مہاتما گاندھی۔ انڈین نیشنل کانگریس اور تمام ہندوؤں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مادر وطن کے ایک بڑے بہادر اور قابل سپوت کی وصیت کو غور سے سنیں اور اسپر ٹھنڈے دل سے غور کریں جس نے میدان جنگ میں آخر وقت تک لڑتے ہوئے خوشی خوشی جان قربان کی ہے۔

بد قسمتی سے انگلستان میں اسکی صحت اس درجہ خراب ہو گئی تھی کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا پھر بھی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ آخر وقت تک اپنے جسمانی درد و تکلیف کے باوجود اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں چاروں طرف مارا مارا پھرتا رہا اگر اس نے احتیاط کے ساتھ ٹھنڈے دل سے کام کیا ہوتا تو ممکن ہے فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہوتا مگر موجودہ بیچینی و غلط فہمی کے دور میں آرام و سکون اسکے لئے ناممکن الحصول تھے۔ بہر حال جو کچھ اس سے ہو سکا وہ اسنے کیا اور آخر میں ایک بہادر سپاہی کی طرح ہنستا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے آخری الفاظ میری گویائی سے کہیں زیادہ گویا ہیں اور میں

پوری اُمید رکھتا ہوں کہ انگریز سکھ اور ہندو تمام ان کو غور سے پڑھیں گے۔ میری دعا ہے کہ خدا محمد علی کے آخری پیغام سے ان تمام لوگوں کے دل نرم کردے اور ان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ صحیح صلح کے لئے تیار ہو جائیں۔ مجھکو بخوبی معلوم ہے کہ وہ تمام محمد علی کی عزت کرتے تھے، اور اب اسکے مرنے کے بعد اور بھی زیادہ عزت کرتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانان ہند یا مسلمانان عالم کا تعلق ہے ان کا تو وہ عزیز ترین محبوب تھا۔ مذہب اسلام کے ساتھ محمد علی کا شغف اور اس دین متین کی خاطر اس کی سرفروشانہ کوشش ہر مسلمان کے دل میں محمد علی کے لئے گھر بنا گئیں ہیں۔ مسلمانان ہند کے مفاد کی خاطر محمد علی کی اندرون ہند و بیرون ہند کوششیں ایسی تھیں جن کا انعام آج اس کو مل رہا ہے۔ سب لوگ اس سے محبت رکھتے تھے اور آج اس کی جدائی پر ماتم کناں ہیں۔ مجھکو یقین کامل ہے کہ یہ پیش کردہ صفحات جو محمد علی نے اپنے خون سے لکھے تھے ہر شخص پر اپنا خاطر خواہ اثر کریں گے۔

ماہرین فن اطبا رنے مجھ سے کہا کہ محمد علی کی موت قلب کے رُک جانے یا گردہ کی تکلیف سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تہا کہ آخری یادداشت کے لکھانے میں اس کے دماغ پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دماغ میں کئی دن پہلے سے خون بہہ رہا تھا اور اس غیر معمولی کام کی وجہ سے فالج کا اثر ہوگیا، جس کے سبب صبح سات بجے اُٹھنے کے بعد سے وہ کچھ بات چیت نہ کر سکے اور بالآخر ۴ر جنوری کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آخری مرتبہ بیہوش ہونے سے قبل محمد علی دو گھنٹہ تک تو نواب سر عبدالقیوم صاحب سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کے متعلق باتیں کرتے رہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مفاہمت کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں، جب تک کہ اس میں ہندوستان کے بہادر ترین فرزندان توحید یعنی صوبہ سرحد کے بھائیوں کے مطالبات پورے نہ ہوں۔ اس کے

علاوہ دو گھنٹہ تک سر شاہ نواز بھٹو سے صوبہ سندھ کے متعلق باتیں کرتے رہے۔
اس صوبہ سے ان کو سب سے زیادہ محبت اس لئے تھی کہ ہندوستان میں اسلام
یہیں سے داخل ہوا تھا۔ باقی دو گھنٹہ لاہور کی ایک بہن بیگم عزیز کے ساتھ
گفتگو کرتے رہے۔ غرض اس طرح پر وہ مرتے دم تک بہادر مجاہد کی طرح کام کرتے
ہوئے رحلت کر گئے، خدا مرحوم کی روح کو جوار رحمت نصیب کرے اور اس کے رفقار کار
کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ اس کے آخری مشورہ کو قبول کریں۔

آج محمد علی بیت المقدس میں حرم شریف کی ارض پاک میں آرام سے سو رہا ہے۔
لکھو کھا بہادر عرب اپنے بہادر بہائی کی بہادر موت سے چوکنا ہو کر سرگرم عمل ہو گئے
ہیں۔ مجھے اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ صلح کی خاطر محمد علی کے جان دینے نے
انگریزی قوم کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا ہے۔ کیونکہ ان کو اچھی طرح علم تھا کہ محمد علی
حکومت کا سرکش و باغی اس لئے تھا کہ وہ حکومت اسلام اور مادر وطن کے
ساتھ غیر دوستانہ برتاؤ روا رکھتی تھی۔

اب میرے خیال میں انگریزی قوم کے افراد کے دلوں میں ایک حقیقی تبدیلی
پیدا ہو گئی ہے اور اس وقت میں کھلے الفاظ میں اُن کی اس ہمدردی اور مہربانی
کا اعتراف کرتا ہوں جو انہوں نے میرے بہائی کی موت کے وقت بیگم محمد علی۔ میرے
اور ہمارے خاندان کے ساتھ برتی ہے۔ جب اجنبی قوم کی طرف اس طرح کا برتاؤ
ہوا تو مجھے اپنے ہندوستان کے ہندو۔ سکھ اور مسلمان بہائیوں کی طرف سے
اور بہی کچھ زیادہ کی اُمید ہے۔ محمد علی آخر وقت تک ایک باعزت صلح کے لئے لڑتا رہا
اور اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کے کام کو پورا کئے بغیر چین نہ لونگا، اور اسی
ذریعہ سے محمد علی کی روح پر فتوح کو آرام و سکون نصیب ہو سکیگا۔ میری ہر مسلمان
مرد اور عورت سے درخواست ہے کہ وہ اس مشکل کام میں میری مدد کرے۔ خداوند تعالیٰ

سب سے مضبوط اور طاقتور ہے اور ہم اسی کے بھروسہ پر کام کر رہے ہیں وہ انشاء اللہ ہمیں فتحیابی نصیب کریگا۔

اب وقت آگیا ہے کہ تمام مختلف الرائے بھائی یکجہتی سے آگے بڑھیں اور اندرون ہند و بیرون ہند اسلام کے علم کو بلند کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے سامنے خطرات موجود ہیں مگر خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے ہی مسلمان پیدا کیا گیا ہے۔ کمر ہمت باندھ کر آگے بڑھیں تو خدائی امداد ہمیشہ ہمارا ساتھ دیگی۔ اب الفاظ و تقاریر کا وقت نہیں ہے۔ کام اور متحدہ کام ہی میں ہماری نجات مضمر ہے۔ میں اپنے امیر و غریب سب بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر ہماری تاریخ کے اس نازک دور میں تنظیم المسلمین کے کام میں ہماری مدد کریں اپنے امیر بھائیوں سے میں خاص طور پر کہوں گا کہ وہ ہمارے اور ہمارے اسلام کے خطرہ میں گھرے ہونے کے وقت مبہوت نہ ہو جائیں۔ بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے دامے درمے امداد کریں خدا سب کی مدد کرے۔ آمین

شوکت علی خادم کعبہ

دریا گنج۔ دھلی

۳۰ مارچ ۱۹۳۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لندن۔ ہائیڈ پارک ہوٹل، یکم جنوری ۱۹۳۱ء

جناب والا۔

جیسا کہ میں نے کانفرنس کے اجلاس میں کہا تھا، میری صحت اتنی خراب ہے کہ میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے سفر کرنے کے کسی طرح قابل نہ تھا۔ خاص کر جیسا کہ میرے ڈاکٹر آپ کو بتا سکتے ہیں، اور ان تردداتِ کو برداشت کرنے کے بالکل ہی قابل نہ تھا۔ ۱۹ دسمبر کو میں بیہوش ہوگیا، اور ۲۴ گھنٹے سے زیادہ بیہوش رہا۔ میری نبض کی رفتار ۱۴۰، حرارت صرف ۹۷ جو اور بھی کم ہو کر ۹۵ رہ گئی تھی اور میرا تنفس ۳۰ تھا، اس حالت میں بھی جس کام کے لئے میں یہاں آیا تھا، اُس کے کرنے کی خواہش میرے اندر اس قدر قوی تھی کہ میں نے لارڈ چانسلر کو ۸ بجے شام کو ناشتہ کی دعوت دی، یعنی شام کے وقت کو صبح کا وقت سمجھا! دوسرے دن اُنہوں نے کرم فرمایا۔ لیکن میرے بھائی نے اُن کو صرف دس منٹ کے لئے مجھ سے ملنے کی اجازت دی اور اس مختصر وقت میں بھی نہایت دشواری کے ساتھ اپنے خیالات اُن پر ظاہر کر سکا۔

چونکہ میری یہ خواہش تھی کہ میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے نمایندوں اور نیز ہندوستانی نمایندوں (جو میرے خیالات سے کسی حد تک واقف بھی تھے) کو اپنے خیالات سے مطلع کرنے کے لئے اُن خیالات کو حیطۂ تحریر میں لے آؤں اسی لئے میں نے

آپ سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ مہربانی فرماکر میرے پرانے دوست سرجوفری کارٹ کو جس سے میری دوستی چھندواڑہ میں شروع ہوئی تھی، میرے پاس ہوں تاکہ اُنکی موجودگی میں اقلیتوں کے متعلق جن کی کمیٹی کا میں ممبر ہوں، میرے خیالات قلبند کرلئے جائیں۔

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم سوال کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا بالکل غلط ہے۔ ہندوستان میں بلاشبہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں اور یقیناً ہم کو اُن کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آیندہ حکومت ہند، بعض ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی بلکہ تمام ہندوستانیوں کی خدمت ہوگی جس میں ذات اور عقاید کا امتیاز باقی نہ ہوگا۔ تاہم اپنی حکومت کے متعلق اہل ہند کی ذمہ داریوں کے راستے میں ایک مشکل ضرور ہے اور وہ اِن اقلیتوں کا سوال نہیں ہے بلکہ اُن گہرے اختلافات کا سوال ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان موجود ہے۔ یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ مجھے تاریخی حالات بے شمار اور اعداد بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن میں ایک دو یا تین خاص طور پر زور دیکر بیان کردینا چاہتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہوجائیگا کہ ہندو مسلمانوں کا سوال اقلیتوں کے سوال سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے اول یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمان ہندوستان پر آٹھویں صدی کے آغاز سے ۱۹ویں صدی کے وسط تک، کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں حکومت کرتے رہے۔ اسلام اور اتنے عرصہ تک کسی دوسری قوم نے ہندوستان میں حکومت نہیں کی۔ سکھوں کی ایک نسل نے تنہا پنجاب کے صوبہ پر کچھ روز حکومت کی۔ یہ حکومت محض ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں سکھوں کی شجاعت پر حرف رکھوں۔ درانحالیکہ میں پنتھ کے نظام کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اسی طرح مرہٹوں کی لوٹ مار اور اُن کی متحدہ دروبست

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے ہم پلّہ نہیں ہے۔ اس کے بعد خواہ فوجی فتوحات
یا سیاسی چالاکیوں کے ذریعہ سے اسلامی حکومت آخر کار مسلمانوں کے ہاتھ
سے نکل کر برطانیہ کے ہاتھ میں گئی سوائے بعض ہندوستانی ریاستوں کے جو عہد قدیم
سے ہندوؤں کی مخصوص ریاستیں ہیں، اور جو اپنی نسل کا سلسلہ چاند اور سورج سے
بتلاتے ہیں۔ ان ہندو ریاستوں کا تعلق مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ جو کچھ بھی رہا ہو
لیکن اس میں تو ذرا شک نہیں کہ اُن ریاستوں نے ہمیشہ اسلامی حکومت کے
ساتھ گہری وفاداری کے عقائد وابستہ رکھے اور اُن کو اپنے معاملات میں ایسی آزادی
حاصل رہی جس سے برطانوی اقتدار کے زمانہ میں وہ محروم ہوگئیں۔ ان کے علاوہ بعض
ریاستیں وہ ہیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہوئیں، اور برطانوی حکومت نے
اُس کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ بعض ریاستیں، مثلاً حیدر آباد کمپنی سے ابتدائی معاہدوں
کے وقت، بجائے خود کمپنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور زیادہ طاقتور تھیں
لیکن وہ کمپنی کی وفادار اتحادی بن گئیں۔ بعض ایسی تھیں جو کمپنی سے چھوٹی تھیں۔
بہر حال اس بحث سے مجھے فی الحال کوئی تعلق نہیں۔

میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ صحیح یا غلط طور پر مسلمانوں نے ہندوستان
پر کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ پر، آٹھویں صدی سے ۱۹ ویں
صدی تک اس طرح حکومت کی کہ کسی دوسری قوم نے کبھی نہیں کی۔ اس واقعہ کا
نہایت اہم نتیجہ جس سے ہم کو بحث کرنی ہے وہ احساس ہے جو اسلامی حکومت
کے اس طویل اور وسیع دور سے پیدا ہوا۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی قوم
ایسی ہوگی جو عہد قدیم کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف، صحیح یا غلط کوئی شکایت
نہ رکھتی ہو، اور فطرت انسانی کا اقتضا جو ہر ملک کی تاریخ میں عیاں یہی ہے کہ بعض
ہندوؤں اور بعض دوسری قوموں کے افراد کے دلوں میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی

خواہش موجود ہو۔ مگر مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں مثلاً سکھ، مرہٹہ، راجپوت وغیرہ کے خلاف اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی احساس ہے جس سے ہم کو بحث کرنی ضروری ہے، اور جس کے متعلق ہمیں آئندہ کے لئے تحفظ کے ذرائع پیدا کرنے ہیں تاکہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کا ایک ایسا دستور العمل بنایا جائے جس میں تمام قومیں محسوس کریں کہ وہ محفوظ، مساوی اور آزاد ہیں۔ دوسرا قابل غور سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اُس قسم کی اقلیت نہیں ہیں جس معنی میں کہ جنگ کے بعد یورپ میں یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے "جمعیت اقوام" یورپ کی اقلیتوں کا انتظام کرتی ہے، اگر ہمارے ہندوستانی فضلاء اور پروفیسر "جمعیت اقوام" سے اقلیتوں کے متعلق اصول کا رعاریت لاتے ہیں، اور اُسی کے طرز عمل اور طریقہ حکمبرداری کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح جنیوا میں بیٹھ کر ہندوستان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ خود ہندوستان جنیوا کی بہتر رہنمائی کر سکتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو تنہا ہندوستان میں ۷ کروڑ سے زیادہ ہے بآسانی اُس معنی میں اقلیت نہیں کہلائی جا سکتی۔ جس مفہوم میں یہ لفظ جنیوا میں استعمال ہوتا ہے جبکہ ساری دنیا میں یہ قوم ۴۰ کروڑ کے قریب ہے اور اُس کا مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا کی بقیہ اقوام کو اپنے طرز خیال اور اپنے نظریہ کا مقصد بنا لے اور جو ایک عدیم المثال اخوت کی مدعی ہے۔ ایسی قوم کو اقلیت کے نام سے پکارنا محض لغو ہے۔

ان دو خاص نکات کو پیش نظر رکھ کر اب ہم کو چاہیئے کہ اصل بحث پر غور کریں۔ گول میز کانفرنس کے ایک سبہائی ممبر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں قوموں کے درمیان وزیر اعظم ثالث بن جائیں۔ اس تحریر میں بلاشبہ وزیر اعظم کی تعریف و توصیف مضمر تھی، لیکن اُن کی پوزیشن کو اس تجویز نے بہت نازک

بنا دیا اور اس لئے اُنہوں نے شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اُنہوں نے اس تجویز کے اندرونی منشار کو خوب سمجھ لیا ہوگا۔ اسی طرح ہم نے یہ تجاویز بھی سنی نہیں کہ اس معاملہ کو "جمعیت اقوام" کے سپرد کر دیا جائے اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ہندوستان کے گندہ لباس کو ساری دنیا کی نظروں کے سامنے دھویا جائے۔ بحالت موجودہ ہم کو تو اس واقعہ نے کافی بددل کر دیا ہے کہ گول میز کانفرنس کو ہندوستانی فرقہ بندیوں کا "دھوبی تلاؤ" بنالیا گیا۔ یہ سوال تو درحقیقت ہندوستان ہی میں طے ہونا چاہیئے تھا۔ ہم نے دس برس تک ہر قسم کے گرم و سرد میں گاندھی جی کے ساتھ کام کیا اور یہ چیز ہم نے بار بار اُن کے سامنے پیش کی، لیکن ہندوؤں میں اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی ہردلعزیزی قایم رکھنے کے خیال نے کبھی سمجھوتہ نہ ہونے دیا۔ جب ۱۹۲۸ء میں باوجود ہماری پرزور درخواست کے کانگریس نے ہندو مسلم سمجھوتہ نہ کرایا تو سر تیج بہادر سپرو نے انتہائی کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کا سمجھوتہ ہو جائے اور سر بیٹرو بھی اس کے بہت خواہشمند تھے۔ لیکن ہندو مہاسبھا نے گو کہ شروع میں یہ ظاہر کیا کہ وہ اعتدال پسندوں اور مسلمانوں کی اس خواہش میں شریک ہے، لیکن بہت سے جلسوں کو ملتوی کراتے کراتے آخر کار بمبئی کی کانفرنس میں حصہ لینے سے بالکل ہی انکار کر دیا، اور ڈاکٹر مونجے نے تو صاف طور پر اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ گول میز کانفرنس سے پہلے سمجھوتہ کی کوشش کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ کانگریس نے ہندو مہاسبھا کی متابعت کی اور گول میز کانفرنس میں شرکت ہی سے انکار کر دیا، حالانکہ دستور اساسی کے تیار ہونے سے پہلے یہ سمجھوتہ ضروری تھا۔ مہاسبھا کے تین ممبر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے، لیکن اُنہوں نے بھی باوجود ہندو مسلمان اعتدال پسندوں کی

انتہائی کوششوں کے ایک سمجھوتہ نہیں ہونے دیا ہے۔ مجھے اس کے کہنے کی ضرورت
نہیں کہ ان لوگوں نے ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ کی گفتگوؤں میں اور
نیز وزیر اعظم سے گفت و شنید میں کتنا وقت ضائع کیا ہے۔ میرے خیال میں خود
وزیر اعظم اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مگر اب کہ ضابطہ کی ایک کمیٹی اس غرض کے لئے
بنائی گئی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ سمجھوتہ کی بحث کو صاف طور پر بیان کر دیا جائے۔
سب سے پہلے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور دوستانہ طریقہ پر میں وزیر اعظم
کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سوال محض پنجاب یا بنگال کا نہیں ہے، جیسا کہ بعض
وہ سمجھتے ہیں نہ یہ سوال ہے۔ پنجاب میں ۱۱۰ کے بجائے سو کر دینے کا یا اسی قسم
کے کسی تغیر کا، جیسا کہ وزیر اعظم کا خیال اُس وقت معلوم ہوتا تھا، جس وقت
وہ چیکرس میں سمجھوتہ اور صلح کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسا کہ میں نے عام
کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان
کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہم اکثریت کی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ
جو ہزار ہا سال سے تمام نام نہاد ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتے
تھے، اب نہیں چاہتے کہ کوئی اکثریت ہندو یا ہندوستانی ایسی ہو جس کو وہ
اُسی طرح اپنے زیر اقتدار نہ رکھ سکیں، جیسا کہ ہزار ہا سال تک رکھ چکے ہیں۔
مگر ایک فرق ضرور ہے وہ میں کہدوں۔ سر جان سائمن نے سر ویلنٹائین چرول
کے حوالہ سے برہمنوں کے اقتدار کا ذکر کیا ہے اور وہ ذکر کسی قدر بعد از وقت
ہے۔ برہمنوں نے کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ عوام کو تعلیم دی تھی اور یہ خیال
غلط ہی سہی، اُن کو ضرور تھا کہ اُن کے ذریعے عاقبت میں لوگوں کو نجات
حاصل ہوتی ہے۔ مگر اب جو فرقہ اجارہ دار ہے اور چاہتا ہے کہ تمام ہندو
قوم کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھے جبکہ وہی قوم اکثریت رکھتی ہے،

اس فرقے سے نہ ڈاکٹر مونجے اور نہ راجہ نریندر ناتھ تعلق رکھتے ہیں، بلکہ وہ فرقہ بنیئے کا فرقہ ہے؛ جو نہ کسی کے نجات عاقبت کو سمجھتا ہے، نہ اس دنیا میں کسی قوم کو تعلیم دینے کا خیال رکھتا ہے۔ میں شاید ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہشمند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو جائے یعنی، (اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت ہو) وہ اقتدار ختم ہو جائے جو ایک "دوکانداروں کی قوم" نے ہماری قسمتوں پر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے گول میز کانفرنس کے دعوت نامے کے جواب میں ہز اکسیلنسی وائسرائے کو لکھا تھا میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی "دوکانداروں" کی بجائے خود اپنے ملک میں "دوکانداروں" کے ایک ملکی فرقہ کو اپنی قسمتوں پر حاوی کر دیا جائے۔ میرے خیال میں بہت سی سیاسی ہیجانی کو مالی امداد ایک حد تک ذاتی اغراض کے لئے بمبئی اور گجرات کے بنیوں سے مل رہی ہے اور گو کہ میں نے ہمیشہ ایک شلنگ چار پنیس اور ایک شلنگ ۶ پنیس کے نرخ تبادلہ کا مذاق اڑایا ہے، لیکن آج تو سیاسی جنگ، ہندوستان کی آزادی کے لئے اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ شرح تبادلہ کے لئے ہے۔ یہ جنگ بھی خواہ کتنی ہی بجا اور حق پر ہو مگر وسیع معنی میں یہ جنگ ہندوستان کی آزادی کی جنگ نہیں ہے۔

اب ہندو مسلم مسئلہ کو لیجیے۔ یہ کسی صوبہ کا سوال نہیں ہے، ہر صوبہ میں ہندو مسلمانوں کے محسوسات ایک دوسرے کے متعلق کم و بیش یکساں ہیں تین نسلیں گذر چکیں جب مسلمانوں کا اقتدار ہندوستان میں ختم ہوا تھا۔ انگریزوں نے یہ اقتدار زیادہ تر مسلمانوں سے حاصل کیا، اور کسی حد تک مرہٹوں سے جو آخری زمانہ میں دہلی کے مغلیہ دربار کے سربراہ کار تھے اور نیز کسی حد تک پنجاب کے سکھوں سے جن کو خود انگریزوں نے پنجاب میں حکومت کرنے کی

اس لئے اجازت دی کہ انگریز افغانستان سے جنگ کر رہے تھے۔ اب ہندوستان
اُس اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور جیسا کہ دس سال پہلے ظاہر
ہو چکا ہے۔ مسلمان اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کرتے میں
کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ آج بھی کچھ مسلمان کانگریس میں شریک ہیں، لیکن یہ
وہ لوگ ہیں جو یا تو اُس مطالبہ آزادی کی عادت سے مجبور ہو کر جو خود ہم نے دس برس
پہلے پیدا کی تھی، کام کر رہے ہیں یا محض جنبش کا اتباع کر رہے ہیں۔ بہت سے
مسلمان نافرمانی قانون کی تحریک سے اُسی طرح الگ رہے جس طرح دس برس پہلے
ترک موالات کی تحریک سے الگ رہے تھے، جبکہ ٹرکی کا معاملہ بھی اُلجھا ہوا تھا۔ اپنی
اہمیت کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کرنے کی بجائے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ جن کا
میں نے ذکر کیا، جس میں سے بہت سے گول میز کانفرنس کے نمایندے بنائے گئے
ہیں۔ (خواہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ، یا حکومت ہند یا صوبوں کی حکومت نے اُن کو
نامزد کیا ہو) وہ نہیں ہیں جنہوں نے اپنے اثر سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت
سے روکا ہو جیسے کہ دس سال پہلے اُنہوں نے روکا تھا۔ گو کہ یہ کہنا اچھا نہیں معلوم
ہوتا مگر ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہم ہی تھے جن کو تقریباً ہر صوبہ میں لڑائیاں لڑنی
پڑی تھیں اور ہماری ہی کوششوں سے بہت سی جگہ مسلمان کانگریس کی شرکت
سے باز رکھے جا سکے، ہم نے اُن کو سمجھا دیا کہ گذشتہ تحریک گو کہ قومی تحریک تھی مگر موجودہ
تحریک میں (مجھے افسوس ہے کہ میں اُن کی غیر موجودگی میں یہ بات کر رہا ہوں) گاندھی جی
اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں نے ہندو مہاسبھا کو خوش کرنے کے لئے اپنا
سر جھکا دیا ہے۔ اب کہ ہم لوگ یہاں آئے ہیں میں تنہا اپنی پارٹی کا نمایندہ ہوں
حالانکہ میں نے اُس زمانہ میں جب یہاں آنے سے پہلے میں ہندوستان میں بیمار
پڑا ہوا تھا، اور نمایندوں کا آخری انتخاب کیا جا رہا تھا ہز ایکسیلنسی وائسرائے

اس باب میں بہت طویل خط و کتابت کی۔ تنہا میں ہی اپنی پارٹی کا نمایندہ منتخب ہو سکا۔ اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ مجھ ہی سے اور بلاشبہ میرے بھائی سے لاکھوں مسلمان ہمارے واپس جانے کے بعد سوال کریں گے کہ ہم اُن کے لئے گول میز سے کیا لائے۔ ہم یہاں سے محض جداگانہ حق انتخاب اُن کے لئے یا حرف "ڈیٹیچ" لیکر نہیں جانا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم کو یہ چیزیں نہ ملیں تو میں وزیر اعظم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں بلا تکلف شریک ہوں گے۔ ہم یا دوسرے مسلمان نمایندے کچھ ہی کریں اور کچھ ہی کہیں۔

ہندوستان کی آزادی محض "جداگانہ انتخاب" میں مضمر نہیں، گو کہ اس حیثیت سے کہ سنہ میں میں اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے "جداگانہ انتخاب" کے اصول کو پیدا کیا، میں اُس چیز کو ہاتھ سے دینے والا آخری شخص ہوں گا۔

مجھے عرض کر دینا چاہیئے کہ "جداگانہ انتخاب" کا فائدہ کیا ہے۔ جداگانہ حلقہ انتخاب مسلمانوں کو اس کا موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کر سکیں ہر عدالت میں فریق مقدمہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کا وکیل مقرر کرے گو کہ کبھی کبھی گورنمنٹ کے خرچ سے بھی وکیل مقرر کیا جاتا ہے، مگر فریق مخالف کو کبھی اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ دوسرے فریق کے لئے وکیل منتخب کرے۔ اگر جج آزاد اور منصف مزاج ہو تو ایک معتمد وکیل بالکل کافی ہوتا ہے، اور لارڈ مارلے اور منٹو نے ہمارے لئے اسی کا انتظام کیا تھا۔ اُس وقت لارڈ مارلے کے ذہن میں خیال نہ تھا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ کے اصول پر برطانوی حکومت قایم کی جائے، اُس وقت سرکاری ممبروں کا اجتماع موجود تھا۔ حکومت ہند میں برطانوی اکثریت موجود تھی اور وہ اسی لئے قایم رکھی گئی تھی کہ ہندوستان میں اس بات کو ظاہر کرنے کہ پارلیمنٹ کے قایم کرنے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ ہر قوم اپنا معاملہ جج کے سامنے پیش کرتی تھی اور جج فیصلہ کرتا تھا، ہم جج پر کچھ اثر تو ڈال سکتے تھے

مگر نہ اُس کی رہنمائی کرسکتے تھے نہ اُس کو مشورہ دے سکتے تھے۔ اس لئے صرف ایک معتمد وکیل کی ضرورت تھی اور اُس کا انتخاب ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے کرتے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی، اتفاقیہ طور پر، قصداً نہ سہی، لارڈ منٹو نے نہ صرف موجودہ ضرورت کا انتظام کیا تھا بلکہ آیندہ کے لئے بھی کچھ فکر کی تھی۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب صرف مسلمانوں کی مزید امداد کے لئے بنائے گئے تھے تاکہ جو کمی ہندو اکثریت کے مقابلہ میں رہ جائے اُس کو پورا کریں۔ لارڈ مارلے نے مشترکہ انتخاب میں مسلمانوں کو اُن کے حصہ سے محروم نہیں کیا تھا۔ یہی خطرناک غلطی تھی جو ہمارے ہندوستانیوں کے اصرار پر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کی گئی جبکہ ہم دونوں بھائی بوجہ چند واقعہ میں نظر بند تھے، اور لکھنؤ مسلم لیگ و کانگریس کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے۔ آخر کار پہلی دفعہ "جداگانہ انتخاب" کا طریقہ مسلمانوں کی نیابت کا تنہا ذریعہ رہ گیا۔

دوسری خطرناک غلطی اُس وقت یہ کی گئی (جس کے لئے اب مسلمان ۱۴ برس سے رو رہے ہیں) کہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اقلیت کو قلیل اکثریت سے بدل دیا گیا۔ اگر ہمارے دوستوں کی نظر مستقبل پر ہوتی تو وہ پنجاب کو کافی اور بنگال کو ارادی اور کمزور اقلیت نہ بنا دیتے ان ہی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، اس نکتہ پر غلط فہمی کو راہ نہ دیجئے۔ اس نکتہ کو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور وزیر اعظم پہلے سے خوب سمجھ لیں۔ اسی نکتہ سے مجھے اپنی بحث شروع کرنی چاہیئے تھی، لیکن مجھے خوشی ہے کہ زمین کو سنگ بنیاد کے لئے صاف کر دینے کے بعد اب میں اس نکتہ پر پہنچا ہوں۔ اس بحث میں میں زیادہ وقت نہ لوں گا۔ اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے

خواہ قلیل ہو یا کثیر انکو پورے حقوق دیئے جائیں اور ایسے صوبوں میں جہاں اُنکی اقلیت ہے اُنکے حقوق کو محفوظ کیا جائے اور ہندو قوم کیساتھ منصفانہ طرز عمل اختیار کرنیکے غرض سے ہونا چاہئے کہ یہی عمل ہندو قوم کیساتھ کیا جائے جس بات کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر قوم کو ہر صوبہ میں جہاں وہ تعداد میں زیادہ ہو پورے حقوق دیئے جائیں اور جہاں وہ تعداد میں کم ہے اُس کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔

مسلمان جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے (اور یہی ۱۴ پوائنٹ کا لب لباب ہے۔ حق انتخاب جداگانہ اصل چیز نہیں ہے) کہ ہر جگہ فیڈرل گورنمنٹ ہو تاکہ مرکزی حکومت جہاں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ہوگی، اُن کو ہر موقعہ پر نہ دبا سکے اور یہ کہ صوبوں کی فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کو ہر جگہ ہندوستانی نائبین کی کل تعداد کم از کم ایک تہائی جگہیں دی جائیں نیز یہ کہ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی قلیل اکثریت ہے اور جہاں اُس اکثریت پر بنیوں اور سکھوں اور ہندو زمینداروں کے اثرات حاوی ہیں، جیسی کہ بنگال میں حالت ہے یہ اکثریت محفوظ کر دی جائے (ذاتی طور پر اگر صرف آیندہ ۲۰ برس کے لئے ایسا کر دیا جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا) علاوہ بریں سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے پوری اصلاحات مسلمانوں کو دی جائیں جو اب تک برطانوی فوجی اور سول اقتدار اور نیز ہندوؤں کی قدرتی تنگ نظری کے باعث نہیں دی گئی ہیں اور سندھ کو آسام کی طرح ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح محفوظ ہو جائے جس طرح ہندوؤں کی اکثریت دیگر صوبوں میں ہوگی اگر نئے دستور کے ماتحت ان چند صوبوں میں مسلم اکثریت قایم نہ کر دی گئی میں عرض کرتا ہوں، دھمکی نہیں دیتا مگر نہایت ادب سے اور دوستانہ طور پر تنبیہ کرتا ہوں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہو جائیگی۔ اس حقیقت کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔

یہ چار یا پانچ صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کو وہی قوت حاصل ہو جو ہندوؤں کو تمام دوسرے صوبوں میں حاصل ہوگی اور ہندوؤں کا وہی تحفظ کیا جائے جو مسلمان اپنی اقلیت کے لئے مانگتے ہیں۔

پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلم اکثریت صرف بقدر ۶ اور ۵ کے ہے یہ بالکل ناممکن ہے

سکھوں یا یورپین لوگوں کو اُن کی تعداد سے زیادہ کچھ حقوق دیئے جاسکیں اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہے جیسا کہ میں ابھی واضح کروں گا۔ " ویٹیج " دینے کا تمام منصوبہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ صرف دو صوبوں میں مسلمانوں کی قلیل اکثریت سے اُن کو محروم کر دیا جائے۔

ان دونوں صوبوں میں رائے دینے کا حق چاہے دونوں صوبوں کے لئے مساوی ہو یا نہ ہو مگر مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونا چاہیئے۔ رائے دینے کے حق کا سوال کوئی مذہبی یا شرعی مسئلہ تو ہے نہیں جس میں انتہائی سختی برتی جائے (خود کونسل آف اسٹیٹ کے موجودہ حق رائے دہندگی کو دیکھ لیجئے)۔ ہر حال میں مسلمانوں کی جگہیں ۲۰ سال کے لئے اُسی آبادی کی نسبت سے محفوظ کر دی جائیں اس لئے کہ وہ ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہیں اور نو دولت سکھوں کے بہت زیادہ زیر اثر ہیں۔ نہرو رپورٹ میں عام طور پر ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دینے کی تجویز محض مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے پیش کی گئی تھی۔ ایک سچے مسلمان سے زیادہ بالغوں کے اس حق کا حامی کوئی نہیں ہو سکتا مگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے بالغ مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن آیندہ بیس برس تک کم از کم مسلمان عورتیں بالغہ ہو کر بھی ووٹ دینے گھر سے باہر نہ جائینگی خواہ کتنے اچھے پردہ کے انتظامات کیوں نہ کئے جائیں اور خواہ صرف پردہ نشین افسران ہی اُن کی پرچہ اندازی کی نگرانی کیوں نہ کریں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ آریوں اور پنجاب کے ہنود اور سکھوں کے مقابلہ میں مسلمان عورتیں نقصان میں رہیں گی۔ لہٰذا بالغوں کا عام حق رائے دہندگی اس وقت بالکل ناقابل توجہ ہے۔ پنجاب اور بنگال کے ان دو صوبوں میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف کہ کونسلوں میں اُن کی تعداد ۵۲ اور ۵۵ فیصدی ہو کوئی امر قابل توجہ نہیں ہو سکتا۔

سکھوں نے اپنی حکومت کے قلیل زمانہ میں پنجاب میں اس قدر زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور آج تک دیہات کے لوگوں پر اُس کا اتنا زیادہ دباؤ ہے کہ اُن کو ہرگز کسی مزید تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ بارہا انہوں نے خود لکھا ہے کہ اگر مسلمان " فرقہ بندی " کو " قوم پرستی " کے مقابلہ میں ترک کر دیں گے تو وہ " فرقہ بندی " کو چھوڑ کر عام انتخاب کے نتائج پر رضامند رہیں گے۔

اُن کے اس بیان کو اگر گمراہ کن جذبات سے پاک کرکے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اون کو مسلمانوں کی طرح تحفظ کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اس نے اُن کے حقوق سے زیادہ اون کو کچھ دینے کا سوال غیر ضروری اور محض مہاسبھا کی من گھڑت ہے۔

یہی بات بنگال کے اینگلو انڈین اور یورپین لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے محض بنگال کی کونسل میں چند جگہیں زیادہ یا کم حاصل کرکے وہ تجارت پر اپنے اُس اثر کو قائم نہیں رکھہ سکتے جو اُنہوں جان کمپنی کے زمانہ سے حاصل کر لیا ہے۔ ہمکو کسی اور طریقہ پر اُن کے تحفظ کا انتظام کرنا چاہئیے۔ اور میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ گورنر صوبہ کے لیئے جو مستقل ہدایات مرتب کیجائیں ان میں یہ لکھدیا جائے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس کا مقصد یورپین لوگوں سے انتقام لینا ہو خواہ ہندوستانیوں کے محسوسات اُن کے خلاف کچھہ ہی ہوں۔ ۵ - یا ۶ فیصدی کی زیادتی سے انکا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ وہ بالکل بے اثر رہیگی البتہ دونوں میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہیگی۔

صوبۂ سرحد کے متعلق میں کچھہ نہیں کہتا۔ اسلیئے سرحدی کمیٹی اس سوال پر غور کر رہی گر میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئیے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کو اُن دونوں کی آبادی سے دگنا بلکہ تگنا حق نیابت دیدیں تاکہ ہندو اور سکھ یہ محسوس کریں کہ وہ صوبہ اُن ہی اپنا صوبہ ہے جسطرح مسلمانوں کا ہے اور یہ کہ حکومت میں اُن کو معقول حصہ ملتا ہے۔ یہی احساس مسلمانوں کے اندر ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں پیدا کرانیکی ضرورت ہے جہاں مسلم آبادی صرف ۴ فیصدی ہے اور مدراس میں جہاں وہ صرف ۷ فیصدی ہیں یا اڑیسہ میں جہاں علیٰحدہ صوبہ بننے کے بعد مسلمان تعداد میں بہت کم رہ گئے یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مسلمانوں کے خلاف یا موافق تمام صوبوں میں یکساں جذبات

ہیں اور جب کہ پنجاب میں جہاں اُسکی قلیل اکثریت ہے مسلمانوں کے جذبات اسقدر تلخ ہیں تو ڈاکٹر سوبجے کے صوبہ میں کیا حال ہوگا جہاں اسلامی آبادی بہت قلیل ہے اور جہاں ہندو حکومت مسلمانوں پر قائم ہوگی - خطرہ یہ ہے کہ انتقام کا خیال ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں بہت زیادہ ہے جنکو ہندوستان کی غلط تاریخ اکثر سیاسی اغراض کے لیئے پڑہائی گئی ہے -

البتہ ہندوستانی ریاستوں میں جہاں تاریخ نہیں پڑہائی جاتی ہے مگر جہاں والیان ریاست کی انسانیت باوجود اپنی کمزوریوں کے بہتر تاریخ بنانے میں مسلمانوں کے حقوق کا زیادہ تحفظ کیا جاتا ہے اور باوجود جمہوریت پسند ہونے کے میں اس حقیقت کا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں -

بر سبیل تذکرہ مجھے اس حقیقت کا ذکر کردینا چاہیئے کہ اقلیتوں میں مسلمانوں کی ہر دلعزیزی ½ ۱۲ سو برس کی ملک گیری کے بعد کیونکر زیادہ ہوسکتی ہے - کچھ لوگ مسلمانوں سے اسلیئے ناراض ہیں کہ کسی زمانہ میں اُنہوں نے ایران کو فتح کرلیا تھا، کچھ اس سے ناخوش ہیں کہ اُنہوں نے بزنطیم، شام اور مصر کو تسخیر کیا تھا اور جنگ صلیبی میں فلسطین کو اپنے قبضہ سے نکلنے نہ دیا ! بہر حال جس کسی نے بھی ہندوستان پر حکومت کی، وہ خواہ مسلمان یا انگریز اسکو اپنی پرانی رعایا کے اصل یا فرضی شکایتوں کا سامنا کرنا ہی پڑیگا - اور یہ امر تعجب انگیز ہے کہ مسلمان اب بھی کم اپنی رعایا کے محبوب ہیں - انگریز خود اپنے خلاف اس جذبۂ انتقام کا اندازہ کرسکتے ہیں اور جدید دستور کے بنانے کے لیئے انہیں کم ازکم ایک عرصہ کے لیئے اس جذبۂ انتقام کا لحاظ رکھنا چاہیئے -

اب میں اقلیتوں کے تحفظ کے سوال سے بحث کرونگا - ۱۴ شرطوں میں اکثر شرطیں اقلیتوں کے تحفظ کے لیئے ہیں، مثلاً یہ شرط کہ کونسلوں میں کوئی ایسا قانون جسکے خلاف ہندو

یا مسلم اقلیت کی ۳/۴ نائبین اور جسکو یہ ۳/۴ اقلیت اپنے مفاد کے خلاف سمجھے پیش اور منظور نہ ہو سکیگا۔ یہ ایک تاریخی شرط ہے جو کانگریس نے اسوقت لگائی تہی جب ۱۸۸۸ء میں مسٹر بدالدین طیب جی نے جو کانگریس میں شریک ہونیوالے دوسرے نامور مسلمان تہے سر سید احمد خان کو شرکت کی دعوت دی تہی۔ ایک ایسی شرط جسکو ہندوستان کے اس پارلیمنٹ (کانگریس) نے جس کے پاس کوئی طاقت نہ تہی اور جو صرف بحث مباحثہ کر سکتی تہی خوشی سے منظور کیا تہا، اب بہی اُس پارلیمنٹ کو منظور کرنا چاہیئے جب کہ اُسکی طاقت تسلیم کیجاتی ہے اور اسکو اختیارات دیئے جانیوالے ہیں۔ میں تو مصر ہوں کہ اس شرط کے الفاظ کانگریس ہی کے دستور العمل سے نقل کیئے جائیں۔

یہ یاد رکہنا چاہیئے کہ یہ شرط کسی مذہب کے تحفظ کے لیئے نہیں ہے بلکہ قومی مفاد کے تحفظ کے لیئے پیش کیجاتی ہے۔ مذہب قانون سے بالاتر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اجلاس کانفرنس سے چلا آیا تھا جب وزیر اعظم نے فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ہمیں یہ نکتہ نوٹ کرلینا چاہیئے کہ کوئی قانون کسی مذہب یا کسی مذہب کے رسم ورواج کے متعلق نہ پیش کیا جائیگا جب تک گورنر منظوری نہ دے۔ اب بہی اس شرط کیوجہ سے کافی خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ ساردا ایکٹ کے متعلق پاس نہ ہونے کے بعد ہی گورنر نہیں لی گئی بلکہ منظوری صرف ایک مسودہ قانون کے لیئے دی گئی تہی جو ابتداً پیش کیا گیا تہا مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر ہندو یا کسی دوسرے "مائل بہ ترقی" مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے متعلق قانون بنانے چاہیں۔ مگر میرا مذہب تو ایسا "مائل بہ ترقی" نہیں ہے۔ وہ تو خدا کے بنائے ہوئے قانون رکہتا ہے میں نے یہ حقیقت اُس بیان میں واضح کردی تھی جو ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو علماء اور لیڈروں کے ایک وفد کیساتھ میں نے ہز ایکسلنسی وایسرائے کے سامنے پیش کیا تھا اور جسکی ایک نقل میں اس تحریر کیساتھ پیش کرتا ہوں۔

اسقدر اہم معاملات جیساکہ یہ ہے، عجلت کیساتھ طے نہ ہونے چاہئیں اور جب پھر موقع آئیگا تو میں یہ طے کرانے کی کوشش کرونگا کہ کم از کم مسلمانوں کا مذہب انسانوں کی قانون سازی سے بالاتر رکھا جائے چاہے قانون ساز جماعت برطانوی پارلیمنٹ پارلیمنٹ ہو یا ہندوستانی - بغیر اسکے کوئی مسلمان کسی دستور اساسی کے ساتھ وفاداری کا وعدہ نہیں کرسکتا۔

اب میں صرف ایک لفظ "   " کے متعلق کہونگا جو مسلمانوں کو حاصل ہے اور وہ ہر ایسے صوبہ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں اُن کی اقلیت بہت کمزور ہے کسی صوبہ میں اس "ویٹیج" سے اُن کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی جیساکہ شکسپیر نے یہودیوں کے متعلق کہا تھا، کہ قوت برداشت اس فرقہ کا تمغۂ امتیاز ہے - مگر "ویٹیج" ہر جگہ مسلمانوں کے وزن میں کسی قدر اضافہ کرتا ہے اور اس اضافہ کی ضرورت کو مجھ سے زیادہ کوئی محسوس نہیں کرسکتا جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ بیماری کی وجہ سے میری غیر حاضری میں اقلیتوں کی کمیٹی اور دوسری جگہوں پر میری جماعت کی کوئی نمائندگی باقی نہیں رہی "ویٹیج" سے صرف اتنا ہوگا کہ یہ ایسی قوم جسکی نمائندگی اسقدر کم ہو یہ احساس پیدا ہو جائیگا کہ حکومت میں ہمارا ابھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اسکے سوا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوگا - وہی "ویٹیج" جو مسلمان مانگتے ہیں وہ ہندوؤں کو بھی ہر ایسے صوبہ میں دینے کے لئے طیار ہیں جہاں اتنی ہی کم ہندو اقلیت ہو۔ لیکن بنگال یا پنجاب میں جہاں ہندو اقلیت درحقیقت بہت زیادہ منظم اور سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ قوی ہے اور بہت دولتمند اور بہت تعلیم یافتہ ہے۔ وہاں "ویٹیج" کا مطالبہ بہت لغو ہے - یہی پنجاب میں سکھوں کے متعلق کہی جاسکتی ہے، جو قطع نظر تمام دوسرے مباحث کے معاشرتی حیثیت سے ہندو ہیں اور سیاسی حیثیت سے ہندو قوم کیساتھ ملکر کام کرتے رہے ہیں۔ سندھ میں بھی ہندو اقلیت زیادہ منظم

زیادہ دولت مند اور مسلمانوں سے زیادہ تعلیمیافتہ ہے باوجودیکہ مسلمان بڑے بڑے زمیندار ہیں۔ پھر بھی اون کو "ویٹیج" دینا چاہتا ہوں اتنا کہ بڑے سے بڑے حریص کی بھوک کو تشفی دے سکے!

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اوس معنی میں فرقہ پرست ہوں جو معنی فرقہ پرستی کے یورپ میں سمجھے جاتے ہیں، باوجودیکہ بیس ۲۰ برس پہلے میں انتخاب جداگانہ کی تجویز کے مصنفوں میں سے ایک تھا، میں نے محسوس کیا ہے کہ اب اُسکا وقت گزر گیا اور یہ کہ اب ہندوستانی قوم پرستی کے مفاد کی خاطر ہمکو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بربنائے قبول کر لیئے جائیں۔ لیکن انگلستان کی طرح ہمکو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بربنائے رقبہ محض لغویت ہوگی۔ فرض کیجیئے کہ نواب عبدالقیوم یا ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں جہاں اقلیتوں کی تعداد صرف ۴ اور ۷ فیصدی ہے اُن کو اپنے صحیح نمایندوں کے انتخاب کرانے کا کوئی موقع نہیں مِل سکتا چاہے ان کے لیئے یہ جگہ کونسل میں محفوظ ہوں اگر ۹۶ فیصدی اور ۹۳ فیصدی اکثریت کے ہاتھ میں اقلیتوں کے نمایندوں کا انتخاب چھوڑ دیا گیا۔ محض بیکار اور کمزور اشخاص جو صرف مذہبی مسائل سے مسلمان یا ہندو کہے جاتے ہوں۔ سیاسی نقطۂ نظر رکھنے والے ہندو مسلمان اکثریت کے ووٹ سے منتخب کیئے جائینگے۔ اسلیئے میں نے بہت سے دوستوں سے مشورہ اور گفت گو کرنیکے بعد ایک دوسری تجویز پیدا کی ہے۔ یہ تجویز یقیناً اکثریت کی اُس تجویز سے جو سائمن رپورٹ میں پیش کیگئی ہے زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ دونوں موقعوں کے لیئے جگہیں محفوظ کردی جائیں مگر کوئی امیدوار منتخب نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ

(۱) اپنی قوم کے کم از کم ۴۰ فیصدی ووٹ حاصل نہ کرلے اور

(۲) کم از کم دوسری قوم کے کل ڈالے ہوئے ووٹوں میں سے ۵ فیصدی حاصل

نہ کرلے اگر اُسکی قوم اُس مقام پر دس فیصدی یا اس سے کم ہو لیکن اگر وہ قوم اس سے زیادہ ہو تو امیدوار کے لیے ۱۰ فیصدی ووٹ دوسری قوم کے حاصل کرنا ضروری ہونگے اِسطرح تین مقاصد حاصل ہونگے - اول تو ہر امیدوار کو دونوں قوموں کے پاس اپنی ٹوپی ہاتھ میں لیکر جانا ہوگا جیساکہ منٹو مارلے اصلاحات کے وقت ہوتا تھا مگر اب نہیں ہوتا گویا اسطرح دونوں قوموں کی وہ بے عنوانیاں باقی نہ رہیں گی جو مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے باعث پیدا ہوگئیں جس نے ہندوستان کے سیاسیات اور معاشرتی زندگی کو بھی تباہ کردیا - دوم یہ کہ کوئی شخص کسی قوم کا نائب منتخب نہ ہوگا جب تک کہ وہ اُس قوم کی ایک خاصی تعداد کی نیابت نہ کرتا ہو چاہے وہ اکثریت کا نمائندہ نہ ہو جس کا کہ اب جداگانہ انتخاب میں ہوتا ہے -

تیسرا مقصود بھی کچھ کم اہم نہیں ہے وہ یہ کہ کوئی شخص جو دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ تعلقات نہ رکھتا ہوگا منتخب نہ ہو سکے گا چاہے وہ خود اپنی قوم کے سب ووٹ حاصل کرلے اِسطرح پہلی دفعہ "فرقہ بندی" کا خاتمہ ہو جائیگا اور صحیح "قوم پرستی" پیدا ہوسکیگی - یہ تجویز یقیناً دوسرے طریقوں سے بہتر ہے لیکن اگر کسی قوم کا کوئی امیدوار اس شرط کو پورا نہیں کرسکتا تو پھر وہ شخص منتخب ہوگا جسکے حق میں اُسی قوم کے ووٹ آئے ہوں جسکے لیے وہ جگہ محفوظ ہے یہ گویا موجودہ انتخاب جداگانہ کا تصفیہ ہوگا جو بدقسمتی سے ابھی تک ناگزیر ہے میں جداگانہ انتخاب کا اس سے زیادہ حصہ جدید اداروں اساسی میں جسکے بنانے کی کوشش کیجارہی ہے نہیں چاہتا مگر بغیر ان شرائط مسلمان ہرگز مشترکہ انتخاب کو منظور نہ کرینگے جسمیں ایک بیکار آدمی یا ایسا آدمی جو خودغرضی کیوجہ سے کسی قوم کیساتھ مل گیا ہو اکثریت رکھنے والی قوم کے ۹۶ فیصدی ووٹ سے کامیاب ہوسکتا ہے چاہے خود اُسکی تمام قوم اُسکے خلاف ہو - اس سے زیادہ لغو بات اور کوئی نہیں ہوسکتی -

ہیں اس تحریر کو ہز ایکسیلنسی وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کے سامنے پیش کر چکا ہوں
اور وہ اس تجویز کی معقولیت اور جدت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ میں ہوں
کہ مجھے اس امر کے ظاہر کرنیکا بھی حق ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سرینواس شاستری بھی اگر
زیادہ نہیں تو اسی قدر متاثر ہوئے ہیں۔
ان الفاظ کیساتھ میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں جو وزیر اعظم اور سر جوفری کاربٹ
کی مہربانی سے میں باوجود ڈاکٹروں کی مخالفت کے لکھ چکا ہوں۔ میرے ڈاکٹر میری
اس نافرمانی سے بہت آزردہ ہوئے ہیں لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو میں شاید اُن کی مزید نافرمانی
کرتا اور خود کانفرنس میں جا کر کمیٹی کے سامنے اس معاملہ کو رکھتا۔ چاہے میں اس کام
میں مر ہی جاتا۔ میں اور کمیٹی سے پہنچا کرتا ہوں کہ وہ اس طویل تحریر کو نظر
انداز نہ فرمائیں اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور کریں۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میری
یہ تحریر لاکھوں مسلمانوں کی رائے کا آئینہ ہے جن کی آواز گول میز کانفرنس میں
نہ سنی جائے لیکن جن کے محسوسات کو ہندوستان کے حکام نظر انداز نہیں کر سکتے
جیسا کہ خود سر جوفری کاربٹ جو تمام وقت میرے پاس رہے ہیں بخوبی جانتے ہیں۔

میں ہوں آپ کا اطاعت مند
محمد علی